الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا
يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ

جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔"[۲۸] ع

ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو اُن کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔[۲۹]

[۲۸] یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندیِ درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل اُن سے صادر ہوا تھا اُس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اُس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اِس طرح پردے ہی پردے میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے یہ کہ اس سیاق و سباق میں اس کا ذکر کس مناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائیبل کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اُوریاہ حتی کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اوریاہ کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اُس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں تھی۔ یہ پورا قصہ بائیبل کی کتاب سموئیل دوم، باب ۱۱-۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

اس قصے کی شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔ اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورۂ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاہ (یا جو کچھ بھی اُس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش {غالباً اس بنا پر کی تھی کہ انھیں} اُس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعہ سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے ملک کی ملکہ ہونی چاہیے۔ {پھر اس خواہش کے اظہار میں} کوئی قباحت انہوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن چوں کہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر، قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلہ کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اُس کا صدور خود اُن سے اُس شخص کے

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾
اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي
الْاَرْضِ ۚ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ

یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟[۳۰] یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے[۳۱] جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے

معاملہ میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرمالیا۔

قرآن مجید میں اس مقام پر یہ قصہ دو اغراض کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی غرض نبی ﷺ کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ''جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو۔'' یعنی تمہیں تو ساحر اور کذاب ہی کہا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بندے داؤدؑ پر تو ظالموں نے زنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیے، لہٰذا ان لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اُسے برداشت کرتے رہو۔ دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو، لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہیں چھوڑتا، حتیٰ کہ جو بندے اس کے نہایت محبوب و مقرب ہوتے ہیں، وہ بھی اگر ایک ذرا سی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوندِ عالم اُن سے سخت مواخذہ کرتا ہے۔

[۲۹] یعنی محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا برے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ یہ ارشاد پچھلی تقریر کا ماحصل بھی ہے اور آگے کے مضمون کی تمہید بھی۔ پچھلی تقریر کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان یہاں شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پرس نہ ہو۔ آگے کے مضمون کی تمہید کے طور پر اس فقرے سے کلام کا آغاز کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالق کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعل عبث کا ارتکاب کیا ہے۔ یہی بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو المومنون: ۱۱۵۔ الدخان: ۳۸-۴۰۔

[۳۰] یعنی کیا تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بدآدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔

[۳۱] برکت کے لغوی معنی ہیں ''افزائش خیر و سعادت۔'' قرآن مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے، اُس کی زندگی کو درست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے۔ اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ
سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ ؕ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ
الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ ۙ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ
رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ وقفة رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًاۢ بِالسُّوْقِ
وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ

تا کہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

اور داوٗدؑ کو ہم نے سلیمانؑ (جیسا بیٹا) عطا کیا،[۳۲] بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔ قابل ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اُس کے سامنے خوب سدھے ہوئے گھوڑے پیش کیے گئے[۳۳] تو اُس نے کہا "میں نے اس مال[۳۴] کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔" یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے[۳۵] لگے۔ اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔

[۳۲] حضرت سلیمان علیہم السلام کا ذکر اس سے پہلے البقرہ، آیت ۱۰۲۔ الانبیاء، آیات ۷۷ تا ۸۲۔ النمل، آیات ۱۵ تا ۴۴۔ سورہ سبا، آیات ۱۲۔ ۱۴ میں گزر چکا ہے۔

[۳۳] اصل الفاظ ہیں الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اچھل کود نہ کریں، اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

[۳۴] اصل میں لفظ خَیر استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں مالِ کثیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گھوڑوں کے لیے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے رکھا تھا، اس لیے انہوں نے "خیر" کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

[۳۵] ان آیات کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ {ہمارے نزدیک ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ} حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جب اعلیٰ درجے کے اصیل گھوڑوں کا ایک دستہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، یہ مال مجھے کچھ اپنی بڑائی کی غرض سے یا اپنے نفس کی خاطر محبوب نہیں ہے بلکہ ان چیزوں سے دلچسپی کو میں اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے لیے پسند کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے ان گھوڑوں کی دوڑ کرائی یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اُن کو واپس طلب فرمایا اور جب وہ آئے تو بقول ابن عباسؓ، جعل یمسح اعراف الخیل وعراقیبها حُبًّا لها، "حضرت اُن کی گردنوں پر اور ان کی پنڈلیوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔"

اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے حق میں نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا) کے تعریفی کلمات ارشاد فرمانے کے معاً بعد کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ دیکھو،

أَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ
بَعْدِي ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ

پھر اُس نے رجوع کیا اور کہا کہ ''اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔''[۳۶] تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا، جو اس کے حکم سے

وہ ہمارا ایسا اچھا بندہ تھا، بادشاہی کا سروسامان اُس کو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ ہماری خاطر پسند تھا، اپنے شان دار رسالے کو دیکھ کر دنیا پرست فرماں رواؤں کی طرح اس نے ڈینگیں نہ ماریں بلکہ اُس وقت بھی ہم ہی اُسے یاد آئے۔

[۳۶] سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اِس جگہ اصل مقصد یہی واقعہ بیان کرنا ہے اور پچھلی آیات اسی کے لیے بطور تمہید ارشاد ہوئی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی طرح جو پہلے گزر چکا ہے یہاں بھی ترتیب کلام یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ بلند اور شانِ بندگی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا، پھر اُن کی یہ شانِ بندگی دکھائی گئی ہے کہ جب ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا گیا تو وہ فوراً ہی اپنی لغزش پر متنبہ ہو گئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر انہوں نے اپنی اُس بات سے رجوع کر لیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ان دونوں قصوں سے بیک وقت دو باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کے بے لاگ محاسبے سے {حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے عالی مرتبہ انبیاء اور محبوب بندے} تک نہیں بچ سکے ہیں، تا بدیگراں چہ رسد۔ دوسرے یہ کہ بندے کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ جس وقت بھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اُسی وقت وہ عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے۔ اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لغزشوں کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اور زیادہ الطاف و عنایات سے نوازا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جسد کا لا کر ڈالا جانا اُن کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انہوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مفسرین نے {مختلف باتیں کہی ہیں۔ لیکن وہ یا تو ایسی باتیں ہیں جن کا قرآن کے الفاظ ساتھ نہیں دیتے یا وہ عقل صریح کے خلاف ہیں}۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کو دُعا کے یہ الفاظ کہ ''اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو''، اگر تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آئندہ انہی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں ''فتنہ'' قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب اُن کا ولی عہد رُحبعام ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اُٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اُن کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ ایک کندۂ ناتراش تھا۔ تب انہوں نے اپنی اس خواہش سے رجوع کیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے، میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی وصیت نہیں کی تھی۔

رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ
مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ

نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا،[۳۷] اور شیاطین کو مسخر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے۔[۳۸] (ہم نے اُس سے کہا) "یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں۔[۳۹]" یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔[۴۰] ع
اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو،[۴۱]

[۳۷] اس کی تشریح سورۂ انبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۷۴) البتہ یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت سلیمانؑ کے لیے ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں الریح عاصفة (بادِ تند) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسی ہوا کے متعلق فرمایا گیا ہے تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً (وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا بجائے خود تو بادِ تند تھی، جیسی کہ بادبانی جہازوں کو چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے، مگر حضرت سلیمانؑ کے لیے وہ اس معنی میں نرم بنا دی گئی تھی کہ جدھر اُن کے تجارتی بیڑوں کو سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اُسی طرف وہ چلتی تھی۔

[۳۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الانبیاء، حاشیہ ۷۵۔ النمل، حواشی ۲۳۔ ۲۸۔ ۴۵۔ شیاطین سے مراد جن ہیں۔ اور "پابندِ سلاسل شیاطین" سے مراد وہ خدمت گار شیاطین ہیں جنہیں شرارت کی پاداش میں مقید کر دیا جاتا تھا۔ جس سے وہ بھاگنے اور شرارت کرنے پر قادر نہ رہتے تھے۔

[۳۹] اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہماری بے حساب بخشش ہے، تمہیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ دوسرے یہ کہ یہ ہماری بخشش ہے، جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو، دینے یا نہ دینے پر تم سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا۔ ایک اور مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ شیاطین کلیتاً تمہارے تصرف میں دے دیے گئے ہیں، ان میں سے جسے چاہو رہا کر دو اور جسے چاہو روک رکھو، اس پر کوئی محاسبہ تم سے نہ ہوگا۔

[۴۰] اس ذکر سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی اکڑ جتنی مبغوض ہے، اُس کی عاجزی کی ادا اتنی ہی محبوب ہے۔ {اس عاجزی کے نتیجے میں} اس پر وہ نوازشات فرمائی جاتی ہیں جو داؤد و سلیمان علیہما السلام پر فرمائی گئیں۔ حضرت سلیمانؑ نے استغفار کے بعد جو دُعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ بلفظ پورا کیا اور ان کو فی الواقع ایسی بادشاہی دی جو نہ اُن سے پہلے کسی کو ملی تھی، نہ اُن کے بعد آج تک کسی کو عطا کی گئی۔ ہواؤں پر تصرف اور جنوں پر حکمرانی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے جو انسانی تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی کو بخشی گئی ہے، کوئی دوسرا اس میں ان کا شریک نہیں ہے۔

[۴۱] یہ چوتھا مقام ہے جہاں حضرت ایوبؑ کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کے حالات کی تفصیل {معلوم کرنے کے لیے دیکھیے سورۂ انبیاء، حاشیہ ۷۱ تا ۷۹}۔

أَيُّوبَ ۘ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ﴿٤١﴾ ۖ وقف لازم
ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهُ
أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٤٣﴾
وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ

جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔[۴۲] (ہم نے اُسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔[۴۳] ہم نے اُسے اس کے اہل وعیال واپس دیے اور اُن کے ساتھ اتنے ہی اور،[۴۴] اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، اور عقل وفکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔[۴۵] (اور ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک مُٹھا لے اور اُس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ۔[۴۶] ہم نے اسے صابر پایا،

[۴۲] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے بیماری میں مبتلا کر دیا ہے اور میرے اوپر مصائب نازل کر دیے ہیں، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بیماری کی شدت، مال ودولت کے ضیاع، اور اعزہ واقربا کے منہ موڑ لینے سے میں جس تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہوں اُس سے بڑھ کر تکلیف اور عذاب میرے لیے یہ ہے کہ شیطان اپنے وسوسوں سے مجھے تنگ کر رہا ہے، وہ ان حالات میں مجھے اپنے رب سے مایوس کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے اپنے رب کا ناشکرا بنانا چاہتا ہے، اور اس بات کے درپے ہے کہ میں دامن صبر ہاتھ سے چھوڑ بیٹھوں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی فریاد کا یہ مطلب ہمارے نزدیک دو وجوہ سے قابل ترجیح ہے: ایک یہ کہ قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ نے شیطان کو صرف وسوسہ اندازی ہی کی طاقت عطا فرمائی ہے، {نہ کہ کسی کو بیمار ڈال دینے کی یا جسمانی اذیتیں پہنچانے کی}۔ دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت ایوبؑ اپنی بیماری کی شکایت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے ہیں وہاں شیطان کا کوئی ذکر نہیں کرتے ہیں بلکہ صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ''مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔''

[۴۳] یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا، جس کا پانی پینا اور اُس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مرض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائیبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔

[۴۴] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری میں حضرت ایوبؑ کی بیوی کے سوا اور سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا حتیٰ کہ اولاد تک ان سے منہ موڑ گئی تھی۔ اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہا ہے کہ جب ہم نے ان کو شفا عطا فرمائی تو سارا خاندان ان کے پاس پلٹ آیا، اور پھر ہم نے ان کو مزید اولاد عطا کی۔

[۴۵] یعنی اس میں ایک صاحبِ عقل آدمی کے لیے یہ سبق ہے کہ انسان کو نہ اچھے حالات میں خدا کو بھول کر سرکش بننا چاہیے اور نہ برے حالات میں اُس سے مایوس ہونا چاہیے۔

[۴۶] اِن الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ایوبؑ نے بیماری کی حالت میں ناراض ہو کر کسی کو مارنے کی قسم کھائی تھی، (روایات یہ ہیں کہ بیوی کو مارنے کی قسم کھائی تھی) اور اس قسم ہی میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تجھے اتنے کوڑے ماروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرما دی اور حالتِ مرض کا وہ غصہ دور ہو گیا جس میں یہ قسم کھائی گئی تھی، تو اُن کو یہ پریشانی لاحق

صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ
ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ؕ ﴿۴۷﴾

بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔[۴۷] اور ہمارے بندوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر کرو۔ بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے۔[۴۸] ہم نے اُن کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا، اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی۔[۴۹] یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے۔

ہوئی کہ قسم پوری کرتا ہوں تو خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو مارنا پڑے گا، اور قسم توڑتا ہوں تو یہ بھی ایک گناہ کا ارتکاب ہے۔ اِس مشکل سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح نکالا کہ انہیں حکم دیا، ایک جھاڑو لو جس میں اتنے ہی تنکے ہوں جتنے کوڑے تم نے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور اس جھاڑو سے اُس شخص کو بس ایک ضرب لگا دو، تا کہ تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے اور اسے ناروا تکلیف بھی نہ پہنچے۔

بعض فقہاء اس رعایت کو حضرت ایوبؑ کے لیے خاص سمجھتے ہیں، اور بعض فقہاء کے نزدیک دوسرے لوگ بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو حیلۂ شرعی کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حیلہ ہی تھا جو حضرت ایوبؑ کو بتایا گیا تھا، لیکن وہ کسی فرض سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ ایک برائی سے بچنے کے لیے بتایا گیا تھا۔ لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ اور برائی کو دفع کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔

[۴۷] حضرت ایوبؑ کا ذکر اس سیاق و سباق میں یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندے جب مصائب و شدائد میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے رب سے شکوہ سنج نہیں ہوتے بلکہ صبر کے ساتھ اس کی ڈالی ہوئی آزمائشوں کو برداشت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں اور اُسی کی رحمت کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ اُن الطاف و عنایات سے سرفراز ہوتے ہیں جن کی مثال حضرت ایوبؑ کی زندگی میں ملتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کبھی مضطرب ہو کر کسی اخلاقی مخمصے میں پھنس بھی جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں برائی سے بچانے کے لیے ایک راہ نکال دیتا ہے جس طرح اس نے حضرت ایوبؑ کے لیے نکال دی۔

[۴۸] اصل الفاظ ہیں اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (ہاتھوں والے اور نگاہوں والے)۔ ہاتھ سے مراد، قوت و قدرت ہے۔ اور اِن انبیاء کو صاحب قوت و قدرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہایت باعمل لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور معصیتوں سے بچنے کی زبردست طاقت رکھتے تھے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انہوں نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ نگاہ سے مراد آنکھوں کی بینائی نہیں بلکہ دل کی بصیرت ہے۔ وہ حق بیں اور حقیقت شناس لوگ تھے۔ دنیا میں اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر علم و معرفت کی پوری روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو لوگ بدعمل اور گمراہ ہیں وہ درحقیقت ہاتھوں اور آنکھوں، دونوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ والا حقیقت میں وہی ہے جو اللہ کی راہ میں کام کرے اور آنکھوں والا دراصل وہی ہے جو حق کی روشنی اور باطل کی تاریکی میں امتیاز کرے۔

[۴۹] یعنی ان کی تمام سرفرازیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے اندر دنیا طلبی اور دنیا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، ان کی ساری فکر و سعی آخرت کے لیے تھی، یہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے لیے صرف الدّار (وہ گھر، یا اصل گھر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ؕ﴿۴۸﴾ هٰذَا
ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ

اور اسماعیلؑ اور الیسعؑ[۵۰] اور ذوالکفلؑ[۵۱] کا ذکر کرو، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ یہ ایک ذکر تھا۔ (اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے اُن کے لیے کھلے ہوں گے۔[۵۲]

ذہن نشین کرنی مطلوب ہے کہ یہ دنیا سرے سے انسان کا گھر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ صرف ایک گزرگاہ ہے، ایک مسافر خانہ ہے، جس سے آدمی کو بہر حال رخصت ہو جانا ہے۔ اصل گھر وہی آخرت کا گھر ہے۔ جو شخص اس کو سنوارنے کی فکر کرتا ہے وہی صاحب بصیرت ہے اور اللہ کے نزدیک لامحالہ اسی کو پسندیدہ انسان ہونا چاہیے۔ رہا وہ شخص جو اس مسافر خانے میں اپنی چند روزہ قیام گاہ کو سجانے کے لیے وہ حرکتیں کرتا ہے جن سے آخرت کا اصل گھر اُس کے لیے اُجڑ جائے وہ عقل کا اندھا ہے اور فطری بات ہے کہ ایسا آدمی اللہ کو پسند نہیں آ سکتا۔

[۵۰] قرآن مجید میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انعام، آیت ۸۶ میں۔ دوسرے اس جگہ۔ اور دونوں مقامات پر کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ صرف انبیائے کرام کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے اکابر انبیاء میں سے تھے۔ دریائے اُردُن کے کنارے ایک مقام ابیل محولہ (Abel Meholah) کے رہنے والے تھے۔ یہودی اور عیسائی ان کو الیشع (Elisha) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام جس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا میں پناہ گزیں تھے، اُن کو چند اہم کاموں کے لیے شام و فلسطین کی طرف واپس جانے کا حکم دیا گیا، جن میں سے ایک کام یہ تھا کہ حضرت الیسعؑ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کریں۔ اس فرمان کے مطابق جب حضرت الیاسؑ ان کی بستی پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ بارہ جوڑی بیل آگے لیے زمین جوت رہے ہیں اور خود بارھویں جوڑی کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان پر اپنی چادر ڈال دی اور یہ کھیتی باڑی چھوڑ کر ساتھ ہو لیے (سلاطین، باب ۱۹، فقرات ۱۵ تا ۲۱)۔ تقریباً دس بارہ سال یہ اُن کے زیر تربیت رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا تو یہ اُن کی جگہ مقرر ہوئے (۲-سلاطین، باب ۲)۔ بائیبل کی کتاب ۲ سلاطین میں باب ۲ سے ۱۳ تک ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی فلسطین کی اسرائیلی سلطنت جب شرک و بت پرستی اور اخلاقی نجاستوں میں غرق ہوتی ہی چلی گئی تو آخر کار انہوں نے یاہو بن یہوسفط بن نمسی کو اُس خانوادۂ شاہی کے خلاف کھڑا کیا جس کے کرتوتوں سے اسرائیل میں یہ برائیاں پھیلی تھیں، اور اس نے نہ صرف بعل پرستی کا خاتمہ کیا، بلکہ اس بدکردار خاندان کے بچے بچے کو قتل کر دیا۔ لیکن اس اصلاحی انقلاب سے بھی وہ برائیاں پوری طرح نہ مٹ سکیں جو اسرائیل کی رگ رگ میں اُتر چکی تھیں، اور حضرت الیسعؑ کی وفات کے بعد تو انہوں نے طوفانی شکل اختیار کر لی، یہاں تک کہ سامریہ پر اشوریوں کے پے در پے حملے شروع ہو گئے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۷۰، ۷۱)

[۵۱] حضرت ذوالکفلؑ کا ذکر بھی قرآن مجید میں دو ہی جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انبیاء۔ دوسرے یہ مقام۔ ان کے متعلق ہم اپنی تحقیق سورۂ انبیاء میں بیان کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو، حاشیہ ۸۱)

[۵۲] اصل الفاظ ہیں مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان جنتوں میں وہ بے روک ٹوک پھریں گے، کہیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ جنت کے دروازے کھولنے کے لیے کسی کوشش کی حاجت نہ ہوگی بلکہ وہ مجرد اُن کی خواہش پر خود بخود کھل جائیں گے۔ تیسرے یہ کہ جنت کے انتظام پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ اہل جنت کو دیکھتے ہی ان کے لیے دروازے کھول دیں گے۔ یہ تیسرا مضمون قرآن مجید میں ایک اور مقام پر زیادہ صاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا

الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّ
شَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ
لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ؕ وَاِنَّ
لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ
فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ ﴿۵۸﴾ هٰذَا
فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا
بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾
قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾

ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے، اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں[۵۳] ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ یہ تو ہے متقیوں کا انجام۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے، جہنم جس میں وہ جھلسے جائیں گے، بہت ہی بری قیام گاہ۔ یہ ہے اُن کے لیے، پس وہ مزہ چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ،[۵۴] لہو اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنم کی طرف اپنے پیرووں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے) ''یہ ایک لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آ رہا ہے۔ کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے، یہ آگ میں جھلسنے والے ہیں۔'' وہ اُن کو جواب دیں گے، ''نہیں بلکہ تم ہی جھلسے جا رہے ہو، کوئی خیر مقدم تمہارے لیے نہیں۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو، کیسی بری ہے یہ جائے قرار۔'' پھر وہ کہیں گے ''اے ہمارے رب، جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا اُس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے۔''

وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ ''یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلامٌ علیکم، خوش آمدید، ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جائیے۔'' (الزمر: ۷۳)

[۵۳] ہم سن بیویوں کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سن ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہوں گی۔

[۵۴] اصل میں لفظ غَسَّاق استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ایک معنی جسم سے نکلنے والی رطوبت کے ہیں جو پیپ، لہو، کچ لہو وغیرہ کی شکل میں ہو، اور اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ دوسرے معنی انتہائی سرد چیز کے ہیں۔ اور تیسرے معنی انتہائی بدبودار متعفن چیز کے۔ لیکن اس لفظ کا عام استعمال پہلے ہی معنی میں ہوتا ہے، اگرچہ باقی دونوں معنی بھی لغت کے اعتبار سے درست ہیں۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾
اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ
لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ ع ۴ ۲۴ ۱۳
اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ
مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور وہ آپس میں کہیں گے ”کیا بات ہے، ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے؟[۵۵] ہم نے یوں ہی اُن کا مذاق بنالیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟“ بے شک یہ بات سچی ہے، اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں ع

(اے نبیؐ) ان[۵۶] سے کہو، ”میں تو بس خبردار کردینے والا ہوں۔[۵۷] کوئی حقیقی معبود نہیں مگر اللہ جو یکتا ہے، سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اُن ساری چیزوں کا مالک جو اُن کے درمیان ہیں، زبردست اور درگزر کرنے والا۔“ اِن سے کہو ”یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سن کر تم منہ پھیرتے ہو۔[۵۸]“

(اِن سے کہو) ”مجھے اُس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب ملاء اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

[۵۵] مراد ہیں وہ اہلِ ایمان جن کو یہ کفار دنیا میں برا سمجھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حیران ہو ہو کر ہر طرف دیکھیں گے کہ اس جہنم میں ہم اور ہمارے پیشوا تو موجود ہیں مگر اُن لوگوں کا یہاں کہیں پتہ نشان تک نہیں ہے جن کی ہم دنیا میں برائیاں کرتے تھے اور خدا، رسول اور آخرت کی باتیں کرنے پر جن کا مذاق ہماری مجلسوں میں اُڑایا جاتا تھا۔

[۵۶] اب کلام کا رُخ پھر اُسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جس سے تقریر کا آغاز ہوا تھا۔ اِس حصے کو پڑھتے ہوئے پہلے رکوع سے مقابلہ کرتے جایئے، تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آسکے۔

[۵۷] آیت ۴ میں فرمایا گیا تھا کہ یہ لوگ اس بات پر بڑے اچنبھے کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک خبردار کرنے والا خود ان کے درمیان سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہو میرا کام بس تمہیں خبردار کردینا ہے۔ یعنی میں کوئی فوج دار نہیں ہوں کہ زبردستی تمہیں غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے کی طرف کھینچوں۔ میرے سمجھانے سے اگر تم نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ بے خبر ہی رہنا اگر تمہیں پسند ہے تو اپنی غفلت میں سرشار پڑے رہو، اپنا انجام خود دیکھ لو گے۔

[۵۸] یہ جواب ہے کفار کی اُس بات کا جو آیت ۵ میں گزری ہے کہ ”کیا اس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔“ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھاؤ، مگر یہ ہے ایک حقیقت جس کی خبر میں تمہیں دے رہا ہوں، اور تمہارے ناک بھوں چڑھانے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔

اس جواب میں صرف بیان حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقت ہونے کی دلیل بھی اسی میں موجود ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ

اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ
اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ

مجھ کو تو وحی کے ذریعہ سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔'' جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا[۵۹] ''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں،[۶۰] پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں[۶۱] تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔''[۶۲] اس حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔[۶۳] رب نے فرمایا

معبود بہت سے ہیں جن میں سے ایک اللہ بھی ہے، تم نے سارے معبودوں کو ختم کر کے بس ایک معبود کیسے بنا ڈالا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ معبود حقیقی صرف ایک اللہ ہی ہے، کیونکہ وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، اور کائنات کی ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اُس کے ماسوا اس کائنات میں جن ہستیوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو اُس سے مغلوب اور اس کی مملوک نہ ہو۔ یہ مغلوب اور مملوک ہستیاں اُس غالب اور مالک کے ساتھ خدائی میں شریک کیسے ہوسکتی ہیں؟ اور آخر کس حق کی بنا پر انہیں معبود قرار دیا جاسکتا ہے۔

[۵۹] یہ اُس جھگڑے کی تفصیل ہے جس کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور جھگڑے سے مراد شیطان کا خدا سے جھگڑا ہے جیسا کہ آگے کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ''ملاءِ اعلیٰ'' سے مراد فرشتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے شیطان کا مکالمہ دوبدو نہیں بلکہ کسی فرشتے ہی کے توسط سے ہوا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بھی ملاءِ اعلیٰ میں شامل تھا۔ جو قصہ یہاں بیان کیا جارہا ہے وہ اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: سورۃ البقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹۔ الاعراف، آیات ۱۱ تا ۲۴۔ الحجر، آیات ۲۸ تا ۴۳۔ بنی اسرائیل، آیات ۶۱-۶۵۔ الکہف، آیات ۴۷ تا ۵۰۔ طٰہٰ، آیات ۱۱۵ تا ۱۲۴۔

[۶۰] بَشَر کے لغوی معنی ہیں جسم کثیف جس کی ظاہری سطح کسی دوسری چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ انسان کی تخلیق کے بعد تو یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن تخلیق سے پہلے اس کا ذکر لفظ بشر سے کرنے اور اس کو مٹی سے بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ''میں مٹی کا ایک پتلا بنانے والا ہوں جو بال و پر سے عاری ہوگا، یعنی جس کی جلد دوسرے حیوانات کی طرح اُون، یا صوف یا بالوں اور پروں سے ڈھکی ہوئی نہ ہوگی۔''

[۶۱] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الحجر، حاشیہ ۱۹۔ السجدہ، حاشیہ ۱۶۔

[۶۲] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو البقرہ، حاشیہ ۴۵۔ الاعراف، حاشیہ ۱۰۔

[۶۳] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، البقرہ، حاشیہ ۴۷۔ الکہف، حاشیہ ۴۸۔

يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ
اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ
وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۚۖ ﴿۷۷﴾
وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى
يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ

''اے ابلیس، تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے[۶۴]؟ تو بڑا بن رہا ہے یا تو ہے ہی کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟'' اس نے جواب دیا ''میں اُس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اِس کو مٹی سے۔'' فرمایا ''اچھا تو یہاں سے نکل جا[۶۵]، تو مردود ہے[۶۶] اور تیرے اوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے۔''[۶۷] وہ بولا ''اے میرے رب، یہ بات ہے تو پھر اُس وقت تک کے لیے مجھے مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔'' فرمایا، ''اچھا، تجھے اُس روز تک کی مہلت ہے

[۶۴] یہ الفاظ تخلیق انسانی کے شرف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدّام سے کوئی کام کرانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدّام سے کرالیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفس نفیس خود انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلا واسطہ بنایا ہے اُس کے آگے جھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

''دونوں ہاتھوں'' کے لفظ سے غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے جسم حیوانی عطا کیا گیا جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس میں سے ایک نوع ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے اندر وہ رُوح ڈال دی گئی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

[۶۵] یعنی اس مقام سے جہاں آدم کی تخلیق ہوئی اور جہاں آدم کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا اور جہاں ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا۔

[۶۶] اصل میں لفظ ''رَجِیم'' استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''پھینکا ہوا'' یا ''مارا ہوا''۔ اور محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ سورۂ اعراف میں یہی مضمون اِن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ ''پس تو نکل جا، تو ذلیل ہستیوں میں سے ہے۔''

[۶۷] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یوم الجزا کے بعد اُس پر لعنت نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوم الجزا تک تو وہ اس نافرمانی کی پاداش میں مبتلائے لعنت رہے گا، اور یوم الجزا کے بعد وہ اپنے اُن کرتوتوں کی سزا بھگتے گا جو تخلیق آدمؑ کے وقت سے لے کر قیامت تک اس سے سرزد ہوں گے۔

الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾
اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۙ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾
قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾
ع ۵ ۲۴ ۱۴ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ع

جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔'' اس نے کہا ''تیری عزت کی قسم، میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے۔[۶۸]'' فرمایا ''تو حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنم کو تجھ سے[۶۹] اور اُن سب لوگوں سے بھر دوں گا جو اِن انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔''[۷۰]

(اے نبیؐ) اِن سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا،[۷۱] اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔[۷۲] یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا۔ع[۷۳]

[۶۸] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ''میں تیرے چیدہ بندوں کو بہکاؤں گا نہیں''، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''تیرے چیدہ بندوں پر میرا بس نہ چلے گا۔''

[۶۹] ''تجھ سے'' کا خطاب صرف شخص ابلیس ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ پوری جنس شیاطین کی طرف ہے، یعنی ابلیس اور اس کا وہ پورا گروہِ شیاطین جو اُس کے ساتھ مل کر نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے میں لگا رہے گا۔

[۷۰] یہ پورا قصہ سردارانِ قریش کے اس قول کے جواب میں سنایا گیا ہے کہ اَءُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟'' اس کا ایک جواب تو وہ تھا جو آیات ۹ اور ۱۰ میں دیا گیا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے، اور اس میں سرداران قریش کو بتایا گیا ہے کہ محمد ﷺ کے مقابلہ میں تمہارا حسد اور اپنی بڑائی کا گھمنڈ، آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس کے حسد اور گھمنڈ سے ملتا جلتا ہے۔ ابلیس نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس حق کو ماننے سے انکار کیا تھا کہ جسے وہ چاہے اپنا خلیفہ بنائے، اور تم بھی اُس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہو کہ جسے وہ چاہے اپنا رسول بنائے۔ اُس نے آدم کے آگے جھکنے کا حکم نہ مانا اور تم محمد ﷺ کے اتباع کا حکم نہیں مان رہے ہو۔ اس کے ساتھ تمہاری یہ مشابہت بس اس حد پر ختم نہ ہو جائے گی، بلکہ تمہارا انجام بھی پھر وہی ہوگا جو اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے، یعنی دنیا میں خدا کی لعنت، اور آخرت میں جہنم کی آگ۔

[۷۱] یعنی میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے یہ تبلیغ نہیں کر رہا ہوں۔

[۷۲] یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو فی الواقع وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی ﷺ کی زبان سے محض کفار مکہ کی اطلاع کے لیے نہیں کہوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انہی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔

[۷۳] یعنی جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ چند سال کے اندر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری ہو کر رہی۔ اور جو مر جائیں گے ان کو موت کے دروازے سے گزرتے ہی پتہ چل جائے گا کہ حقیقت وہی کچھ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔